اُردو ریسرچ جرنل "تشکیل" جلد:4، شمارہ:1 (جنوری تا جون 2026ء)

Urdu Research Journal Tashkeel ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286
Article Received: 18-03-2026 / Accepted: 23-06-2026 / Published: 30-06-2026
https://creativecommons.org/licenses/by-nc/4.0/
Doi: https://doi.org/10.66457/tashkeel.v4i1.57

قیصرہ تبسّم

ایم فل اُردو اسکالر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

ڈاکٹر محمد فاروق بیگ

اسسٹنٹ پروفیسر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

سلمیٰ اعوان کا ناول لہو رنگ فلسطین: درد، مزاحمت اور امید کا استعارہ

Qaisera Tabassum
M.Phil Urdu Scholar, Riphah International University, Faisalabad Campus
Email: qaiseratabassum33202@gmail.com
ORCID: https://orcid.org/0009-0001-3215-7497
Dr. Muhammad Farooq Baig
Assistant Professor Urdu, Riphah International University, Faisalabad Campus
Email: farooq.baig@riphafsd.edu.pk
ORCID: https://orcid.org/0000-0002-2501-982X

A Novel *Lahoo Rang Falastine* by Salma Awan: A Metaphor for Pain, Resistance and Hope

ABSTRACT
This study analyses the novel Lahoo Rang Falastine by Salma Awan as a powerful literary representation of pain, resistance, and hope. It argues that the novel presents resistance not merely as a political or military response but as a comprehensive intellectual, spiritual, and existential stance rooted in the Palestinian people's deep attachment to their land and identity. The study highlights multiple dimensions of resistance, including cultural preservation and the safeguarding of collective memory. It concludes that Lahoo Rang Palestine elevates resistance from a localised issue to a global moral concern, where hope, unity, and ethical commitment sustain the ongoing struggle for justice and human dignity.
Keywords: *Lahoo Rang Falestine, Metaphor, Resistance, Palestinian Struggle, Cultural Identity, Collective Memory, Urdu Novel, Salma Awan*

ناول لہو رنگ فلسطین میں مزاحمت محض ایک سیاسی ردعمل یا عسکری جدوجہد کا نام نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت فکری، روحانی، تہذیبی اور وجودی رویہ ہے۔ مصنفہ نے فلسطین کے المیے کو صرف قبضے اور جبر کی داستان کے طور پر پیش نہیں

کیا بلکہ اسے انسانی ارادے، اجتماعی شعور اور قومی وقار کی بقا کی جنگ کے طور پر دکھایا ہے۔ اس طرح ناول میں مزاحمت ایک مرکزی تصور کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جو کہانی کے پلاٹ، کرداروں کی نفسیات، مکالموں اور فکری پس منظر میں متحرک نظر آتی ہے۔

ناول میں فلسطینی کرداروں کی زندگی کا بنیادی محرک اپنی سرزمین سے وابستگی ہے۔ یہ وابستگی محض جذباتی نہیں بلکہ وجودی نوعیت رکھتی ہے۔ جب انسان کی زمین، شناخت اور آزادی سلب کی جائے تو اس کی بقا کا تقاضا مزاحمت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے ناول میں مزاحمت کوئی وقتی جوش یا ردعمل نہیں بلکہ ایک مسلسل طرزِ حیات ہے۔ ناول کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "لبنان میں عین الحلوہ کیمپ میں ایک جیل تھی۔ بے بس و بے کس، دکھی اور بے گھر لوگوں کی جیل اور یہی میرے اندر لکیروں سے باتیں کرنے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔ یہ خواہش اتنی شدید ہو گئی تھی کہ میرے لیے کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ کاغذ پنسل تھی نہیں۔ نہیں۔۔۔ میں اپنے اکلوتے کمرے کی مٹی سے لپٹی پٹی دیواریں کوئلے سے لکیریں کھینچ کھینچ کر بھر دیتا۔ بعد میں دیکھتا تو وہ کچھ معنی دیتی شبیہیں ہوتیں۔ جیلوں میں سزائیں کاٹتا۔ باہر آتا تو نعرے لگاتا۔ اپنے لوگوں کی حالتِ زار پر کڑھتا۔ وہ لوگ جن کی زمین فلسطین تھی جو اپنی زمین سے جڑے اس کے کھیتوں باغوں میں سانس لیتے اور جیتے تھے تو جب ان سے ان کے کھیت کھلیان چھین لیے گئے تو گویا اُن سے اُن کی زندگی چھن گئی اور پھر یہیں سے ہم نے انقلاب کا سبق سیکھا۔ یہیں ہم نے عربوں سے نفرت سیکھی۔ یہیں ہم نے اسرائیل کے ظلم سہے جس کے ہر وار میں ہمارے لیے ایک پیغام ہوتا تھا۔ فلسطین کو بھول جاؤ۔ ہم نے جان لیا تھا کہ ہمیں اپنی مدد آپ کرنی ہے۔"(1)

مصنفہ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جب ظلم معمول بن جائے تو مزاحمت فطری عمل بن جاتی ہے۔ فلسطینی کردار اپنی روزمرہ زندگی میں جبر کا سامنا کرتے ہوئے بھی شکست کو قبول نہیں کرتے۔ ان کا جینا، اپنے بچوں کو اپنی تاریخ سنانا اور اپنے گھروں کی یاد کر محفوظ رکھنا سب مزاحمت کی صورتیں ہیں۔ یوں ناول مزاحمت کو ایک فوری اور باوقار ردعمل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ناول میں مسلح جدوجہد کا حوالہ بھی موجود ہے لیکن اسے رومانوی یا جذباتی انداز میں نہیں بلکہ ایک ناگزیر دفاعی ردعمل کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ نوجوان کرداروں میں آزادی کی خواہش اور ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کا جذبہ موجود ہے مگر مصنفہ ان کی داخلی کشمکش کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ وہ دکھاتی ہیں کہ بندوق اٹھانا ان کا پہلا انتخاب نہیں بلکہ حالات کی پیدا کردہ مجبوری ہے۔

"ارے یہ تنگ و تاریک گلیاں، اپنی گلیوں نے ہمارا مان بڑھایا۔ ہماری حفاظت کی۔ ہمارے بچوں، ہمارے گھروں، ہمارے مال و اسباب کی محافظ ثابت ہوئیں۔ انھوں نے تو ماں کی گود کی طرح ہمیں اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ ہماری ان گلیوں میں جب وہ اسرائیلی فوجی دستے ہلکائے کتوں کی طرح بھاگے تو انھیں سمجھ ہی نہیں آتی تھی کدھر جائیں؟ ٹیڑھی میڑھی بھول بھلیوں میں الجھے تو آدھے تو عورتوں اور نوجوان بچوں نے ہی پتھروں، اینٹوں اور گولیوں سے مار ڈالے اور بقیہ مردوں کی بندوقوں کی نذر ہوئے۔ کیا منظر تھا۔ یہاں وہاں ان کتوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ کانوں کو ہاتھ لگا لیا کہ دوبارہ ان میں نہیں آنا۔ اب ہمیں اکیلے قابو کرنا ہے تبھی تو بیرونی راستوں پر بڑے بڑے گیٹ لگائے ہیں۔"(2)

یہاں مزاحمت کا عسکری پہلو محض ہتھیار تک محدود نہیں رہتا بلکہ علامت بن جاتا ہے۔ بندوق دراصل اس عزم کی علامت ہے جو محکوم قوم اپنے وقار کے تحفظ کے لیے اختیار کرتی ہے۔ ناول اس پہلو کو جذباتی نعروں کے بجائے انسانی درد اور قربانی کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ جس سے مزاحمت کا تصور زیادہ حقیقی اور سنجیدہ معلوم ہوتا ہے۔

ناول میں عورت کا کردار مزاحمت کے تصور کو وسعت دیتا ہے۔ عورت یہاں محض مظلوم یا پس منظر کی شخصیت نہیں بلکہ صبر، استقامت اور حوصلے کی علامت ہے۔ وہ اپنے شوہر بیٹے یا بھائی کی جدوجہد میں خاموش قوت کے طور پر شریک ہے۔ اس کی آنکھوں کے آنسو کمزوری نہیں بلکہ قربانی کا استعارہ ہیں۔ مصنفہ نے عورت کو داخلی طاقت کے پیکر کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ گھروں کو سنبھالتی ہے بچوں کو تاریخ اور شناخت سے آگاہ کرتی ہے اور شکست کے ماحول میں امید کا چراغ روشن رکھتی ہے۔ یوں عورت کی خاموشی بھی ایک طرح کی مزاحمت ہے۔ اس کا صبر جبر کے سامنے جھکنے کے بجائے اسے برداشت کر کے زندہ رہنے کا عزم ہے۔

ناول میں مزاحمت کا ایک اہم پہلو تہذیبی بقا ہے۔ فلسطینی کردار اپنی زبان، رسم و رواج، یادوں اور ثقافتی شناخت کو زندہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی زمین کے نام، گاؤں کی یاد اور آبائی گھروں کے قصے اپنی نئی نسل کو سناتے ہیں۔ اس طرح یادداشت ایک مزاحمتی عمل بن جاتی ہے۔ جب کوئی قوم اپنی تاریخ کو محفوظ رکھتی ہے تو وہ دراصل اپنی شناخت کو بچاتی ہے۔ ناول میں یہ پہلو بار بار ابھرتا ہے کہ دشمن صرف زمین پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ تاریخ اور شناخت کو مٹانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اپنی تہذیب سے وابستگی خود ایک مزاحمت ہے۔

ناول میں مذہبی احساس مزاحمت کو تقویت دیتا ہے۔ سرزمین فلسطینی کی تقدیس اور اس سے روحانی وابستگی کرداروں کے حوصلے کو مضبوط کرتی ہے۔ صبر، شہادت، توکل اور دعا جیسے تصورات کرداروں کی نفسیاتی طاقت کا سرچشمہ بنتے ہیں۔ یہ مذہبی حوالہ جذباتی نعرہ نہیں بلکہ اخلاقی جواز کی صورت سامنے آتا ہے۔ یوں مزاحمت صرف سیاسی حق نہیں

بلکہ اخلاقی اور روحانی فریضہ بن جاتی ہے۔ اس تصور سے ناول کا بیانیہ گہرائی اختیار کرتا ہے اور مزاحمت ایک بلند تر معنویت حاصل کر لیتی ہے۔ مصنفہ نے مزاحمت کے نفسیاتی پہلو کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ ظلم کے تسلسل کے باوجود کردار مایوسی کے مکمل اندھیرے میں نہیں ڈوبتے۔ خوف، بے بسی اور دکھ کے باوجود امید باقی رہتی ہے۔ یہ امید ہی اصل مزاحمت ہے۔

"میں زمین کے اس ٹکڑے پر اس کا نام ضرور لکھوں گا
جس پر قبضہ کر لیا گیا
میرے گاؤں کا نقشہ جہاں پھیلا ہوا تھا
کیسا کیسا گھر اُجڑ گیا لٹ گیا
کیسا کیسا درخت
کتنے خوبصورت جنگلی پھول پامال ہو گئے
مجھے انھیں یاد رکھنا ہے اور میں یہ سب لکھتا رہوں گا
اپنے دکھوں کے ہر باب کو سانحہ کے ہر مرحلے کو
چھوٹی بڑی چیزوں کے ناموں کو
اپنے گھر کے آنگن میں کھڑے زیتون کے درخت کو"(3)

داخلی مکالموں اور جذباتی کیفیات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے کہ شکست پہلے ذہن میں جنم لیتی ہے۔ جب تک ذہن آزاد ہو جسمانی قید بھی مکمل غلامی نہیں بن سکتی۔ اس طرح ذہنی آزادی کو مزاحمت کی بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں مزاحمت فرد کی نہیں بلکہ اجتماع کی طاقت سے جڑی ہوئی ہے۔ فلسطینی عوام کا باہمی اتحاد، مشترکہ دکھ اور مشترکہ خواب ایک اجتماعی قوت پیدا کرتے ہیں۔ یہ اجتماعی شعور ہی تحریک کو دوام بخشتا ہے۔ مصنفہ نے دکھایا ہے کہ ایک فرد کی قربانی پورے معاشرے کے لیے علامت بن جاتی ہے۔ شہدا کی یاد، قیدیوں کی استقامت اور ماؤں کا صبر اجتماعی حافظے کا حصہ بن کر مزاحمت کو جاری رکھتے ہیں۔

"میں اپنے اس شہر کی گہما گہمی کی جھلک تمھیں کیسے دکھاؤں؟ صبح سویرے کہیں زیتون لانے کہیں انڈیلنے کا شور، کہیں بیلنے اور کاٹنے کے لیے خام کپاس لانے کا شور شرابا، اناج پیسنے والی مشینوں کی آواز میں، سبزیاں، پھل بیچنے کے لیے آنے والوں اور شہر سے شیفون کے کپڑوں، برتنوں، چاول، کافی خرید کر لے جانے والوں کی رونقیں کیا زندگی تھی اور کیا اس کا حسن تھا؟ اسرائیلی دراصل ہمیں ذلیل و رسوا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہمیں سر اٹھا کر جینے کا حق نہیں ملنا چاہیے۔ ہمارا کوئی علاقہ اگر اپنی آزادی کا اعلان کر دیتا ہے

تو اس کا مطلب ہے فوج کے حملے کی دعوت۔ اگر ان پر سنگ باری کی جائے تو اس کا مطلب قتل وغارت اور اپنے پیاروں کی اموات اور تباہی۔ کیا کیا بتاؤں اور کیا کیا سناؤں۔"(4)

ناول کے مجموعی تاثر میں مزاحمت، مایوسی نہیں بلکہ امید کا استعارہ ہے۔ اگرچہ کہانی میں خون، آنسو اور بربادی کے مناظر موجود ہیں مگر ان سب کے درمیان آزادی کا خواب زندہ رہتا ہے۔ یہی خواب ناول کو محض المیہ بننے سے بچاتا ہے۔ مصنفہ نے اس امید کو جذباتی خوش فہمی کی بجائے جدوجہد سے جوڑا ہے۔ آزادی آسان نہیں مگر ممکن ہے یہی ناول کی روح ہے۔ ناول کا اسلوب بھی مزاحمتی فضا پیدا کرتا ہے۔ علامتوں، استعاروں اور جذباتی منظر نگاری کے ذریعے مصنفہ نے ایک ایسا ماحول تشکیل دیا ہے جہاں ہر منظر جدوجہد کی گواہی دیتا ہے۔ بیانیہ میں شدت بھی ہے اور وقار بھی جو مزاحمت کو فنی سطح پر مضبوط بناتا ہے۔

"پروردگار! میرے فلسطین کو اپنی پناہ میں رکھ۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے میں کتنے بڑے طوفان اٹھ رہے ہیں کہ ان کی دھمک سے دل دہلے جاتے ہیں؟ چاولوں کے دانوں کی طرح کہیں کہیں بکھری یہ یہود قوم کیسے اس پر قابض ہونے کے لیے سیلاب کی طرح امڈی آ رہی ہے؟ عین اسی وقت اس نے دیکھا کہ بیرونی پھاٹک نما دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کھلی۔ پھر تھوڑا سا اور کھلی اور پھر اس میں سے سات آٹھ سال کی ایک صحت مند گلاب رنگ چہرے والی گھبرائی ہوئی بچی نے قدم اندر رکھا اور اسے دیکھتے ہی فرش پر جیسے ساکت ہو گئی۔"(5)

مزاحمت کے تصور کو ناول میں محض عملی جدوجہد تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اسے تاریخی شعور سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ فلسطینی کردار اپنی حالت زار کو وقتی حادثہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک طویل تاریخی تسلسل کا حصہ جانتے ہیں۔ یہی تاریخی آگہی ان کے اندر استقلال پیدا کرتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان پر گزرنے والا ظلم اچانک وارد نہیں ہوا بلکہ ایک منظم منصوبے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس کے مقابلے کے لیے بھی منظم عزم درکار ہے۔ اس شعور کے باعث مزاحمت ان کے لیے ردعمل نہیں بلکہ تاریخ کا تقاضا بن جاتی ہے۔ ناول میں یادداشت کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ بزرگ کردار جب ماضی کے گاؤں، زیتون کے باغات، گھروں کی چھتوں اور گلیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو یہ محض جذباتی یادیں نہیں ہوتیں بلکہ شناخت کی حفاظت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ نئی نسل کو یہ واقعات سنانا دراصل ان کے اندر احساسِ ملکیت اور حق کی آگ روشن کرتا ہے۔ مصنفہ اس عمل کو بڑی باریکی سے پیش کرتی ہیں کہ کس طرح یادوں کی منتقلی بھی ایک خاموش جدوجہد ہے۔ جب تک یاد باقی ہے دعویٰ باقی ہے اور جب تک دعویٰ باقی ہے جدوجہد زندہ ہے۔

"ارے یہ میرا پیارا سا نابلوس شہر۔ انیسویں صدی کے وسط تک تقریباً تین سو گاؤں اور قصبوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض علاقے کا مالک تھا۔ حیفہ جیفہ اسی کی تو حدود میں تھے۔ رملہ اور البیرہ کی پہاڑیاں بھی اسی میں شامل تھیں مگر اسے تو سازشوں نے ختم کر دیا۔ اس کسان شہر کی زمین کی بڑی بڑی خریداریاں یونانی اور لبنانی عیسائی سوروکس خاندان نے کیں جو انھوں نے صیہونی آبادکاروں کے ہاتھوں مہنگے داموں بیچ کر فلسطین کی تاجر برادریوں کے لیے تباہی کا باعث بنادیں۔"(6)

مزاحمت کا ایک اور پہلو معاشرتی ڈھانچے کی مضبوطی میں نظر آتا ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ شدید حالات کے باوجود خاندانی رشتے ٹوٹتے نہیں بلکہ مزید مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اجتماعی غم لوگوں کو قریب لے آتا ہے۔ ایک گھر کا دکھ پورے محلے کا دکھ بن جاتا ہے۔ یہ سماجی یکجہتی دراصل اس طاقت کو جنم دیتی ہے جو بیرونی جبر کے مقابل ڈھال کا کام دیتی ہے۔ مصنفہ نے اس پہلو کو اس انداز میں اجاگر کیا ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ ظلم صرف فرد پر نہیں بلکہ پوری کمیونٹی پر حملہ آور ہے اور اسی لیے اس کا جواب بھی اجتماعی ہونا چاہیے۔

ناول میں نوجوان نسل کی نفسیاتی کیفیات کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ نوجوان کردار ایک ایسے ماحول میں پرورش پاتے ہیں جہاں خوف اور امید دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ وہ ایک طرف تعلیم، خواب اور بہتر مستقبل کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوسری طرف انھیں حقیقت کا سامنا ہے کہ ان کی زمین غیر محفوظ ہے۔ اس دوہری کیفیت سے جو داخلی کشمکش پیدا ہوتی ہے، وہ مزاحمت کی ایک اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض کردار قلم کو ہتھیار بناتے ہیں، بعض آواز کو اور بعض عملی اقدام کو۔ یوں مصنفہ یہ باور کراتی ہیں کہ جدوجہد کی صورتیں یکساں نہیں ہوتیں بلکہ مقصد مشترک رہتا ہے۔

"پھر ایک موٹا تازہ فوجی ایک ہاتھ میں بندوق پکڑے ڈنٹھلوں کو دوسرے ہاتھ سے ہٹاتا ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ میری ماں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ برواہ سے ہو۔ وہ چلا رہا تھا۔ بندوق کی نال سے میرے سر کا نشانہ لیتے ہوئے اس نے اسے باہر نکلنے اور مشرق کی طرف بھاگنے کا کہا۔ برواہ کو بھول جاؤ۔ پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھنا ورنہ گولیاں اندر تک اُتر جائیں گی۔ پھر میری انگلی پکڑے بھاگتی گئی اور میں تب سے آج تک بھاگ رہا ہوں۔ کہیں ظلم پر احتجاج کرتے ہوئے کہیں اپنے حق کے لیے لڑے مرتے، کہیں دل کے جذبات منہ سے لفظوں کی صورت نکالتے۔"(7)

مزاحمت کو ناول میں اخلاقی برتری کے ساتھ بھی جوڑا گیا ہے۔ ظالم قوت کے پاس طاقت، اسلحہ اور اختیار ہے مگر اخلاقی جواز محکوم کے پاس ہے۔ یہی اخلاقی برتری کرداروں کے حوصلے کو قائم رکھتی ہے۔ وہ اپنے موقف کو انصاف کے اصولوں سے وابستہ دیکھتے ہیں۔ اس احساس کے باعث ان کی جدوجہد محض قومی تعصب نہیں بلکہ حق کے دفاع کی

صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مصنفہ نے اس نکتے کو براہِ راست نعرے کی شکل میں نہیں بلکہ واقعات اور مکالمات کے ذریعے واضح کیا ہے۔

ناول میں مزاحمت کو مکمل کامیابی یا فوری فتح سے مشروط نہیں کیا گیا۔ بعض موقع پر کردار وقتی شکست یا نقصان کا سامنا کرتے ہیں گھروں کی مسماری، عزیزوں کی جدائی اور قید و بند کی صعوبتیں کہانی میں تلخی پیدا کرتی ہیں۔ تاہم مصنفہ ان سانحات کو حتمی انجام کے طور پر پیش نہیں کرتیں۔ وہ دکھاتی ہیں کہ نقصان کے باوجود ارادہ باقی رہتا ہے۔ اس طرح مزاحمت کو نتیجے سے زیادہ عمل کا انداز جدوجہد کی فضا کو تقویت دیتا ہے۔ جملوں میں درد کی شدت موجود ہے مگر ساتھ ہی وقار بھی جھلکتا ہے۔ کہیں کہیں منظر نگاری اس قدر اثر انگیز ہو جاتی ہے کہ قاری خود کو اس فضا میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ خون آلود زمین، بکھرے ہوئے گھر اور خاموش آسمان جیسی سب علامتیں بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان علامتوں کے ذریعے مزاحمت کو محض نظری بحث کی بجائے حسی تجربہ بنا دیا گیا ہے۔

> "ابھی مجھ سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا تھا اور جب گلیاں لاشوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بوڑھے، عورتیں، بچے سب ایک دوسرے میں گڈمڈ پڑے تھے۔ شیتلہ کیمپ میں عورتوں کی جانوروں کی طرح چیری ہوئی ٹانگیں، بچوں کی کٹی ہوئی گردنیں، کوڑے کے ڈھیروں پر بکھری جوانوں کی لاشیں دیکھتی تو شاید وہیں پھڑک کر مر جاتی۔ عالمی طاقتوں کی گھناؤنی سازشیں ان کے ہر مسام ہر خلیے میں گھس گئی ہیں۔"(8)

ناول میں مزاحمت اور امید کا باہمی تعلق نمایاں نظر آتا ہے۔ ناول میں اندھیرا مکمل نہیں ہوتا ہر کرب کے ساتھ ایک روشن امکان موجود رہتا ہے۔ بچوں کی ہنسی، ماؤں کی دعاؤں اور نوجوانوں کے عزم میں مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے۔ مصنفہ اس امید کو سطحی خوش فہمی نہیں بناتیں بلکہ اس کا ناطہ قربانی اور استقامت سے جوڑتی ہیں۔ اس طرح امید مزاحمت کا نتیجہ بھی ہے اور اس کی بنیاد بھی۔ مزاحمت کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں علامتی مقامات بھی کردار ادا کرتے ہیں۔ مقدس مقامات، گلیاں، پرانے درخت اور تباہ شدہ مکانات سب اپنی اپنی جگہ معنی رکھتے ہیں۔ یہ مقامات یاد دلاتے ہیں کہ زمین صرف مٹی کا ٹکڑا نہیں بلکہ تاریخ اور جذبات کا مجموعہ ہے۔ جب کوئی کردار ان مقامات کو چھوڑنے سے انکار کرتا ہے تو وہ دراصل اپنی شناخت کے دفاع کا اعلان کرتا ہے۔ ناول اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مزاحمت صرف بیرونی قوت کے خلاف نہیں بلکہ داخلی کمزوریوں کے خلاف بھی ہوتی ہے۔ خوف، مایوسی اور اختلاف ایسے عوامل ہیں جو جدوجہد کو کمزور کر سکتے ہیں۔ مصنفہ بعض کرداروں کی تذبذب آمیز کیفیت دکھا کر یہ واضح کرتی ہیں کہ اصل جنگ اندر سے شروع ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے اندر اتحاد اور اعتماد برقرار رکھتی ہے۔ وہی طویل آزمائش کا مقابلہ

کر سکتی ہے۔ناول میں تعلیم کو بھی مزاحمت کا ذریعہ دکھایا گیا ہے۔کتاب اور شعور کو آزادی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔اس طرح جدوجہد صرف میدان تک محدود نہیں رہتی بلکہ درسگاہوں اور گھروں تک پھیل جاتی ہے۔

لہو رنگ فلسطین میں مزاحمت ایک جامع نظریہ بن کر سامنے آتی ہے۔یہ نظریہ زمین سے محبت، تاریخ سے وابستگی، مذہبی احساس، اخلاقی جواز، سماجی اتحاد اور نفسیاتی استقامت کو یکجا کرتا ہے۔ سلمیٰ اعوان نے اس تصور کو جذباتی خطابت کی بجائے فکری گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کے باعث ناول محض احتجاجی تحریر نہیں رہتا بلکہ ایک سنجیدہ ادبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ناول میں مزاحمت مسلسل بہاؤ کی صورت موجود ہے۔کہانی کے آغاز سے انجام تک یہ مزاحمت کہیں بلند آواز ہے اور کہیں خاموش دعا۔ کہیں یہ اعملی اقدام کی صورت سامنے آتی ہے۔ کبھی یاد کی حفاظت اور اجتماعی نعرہ بن جاتی ہے۔انہی متنوع صورتوں کے امتزاج سے ناول کا فکری ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے۔

ناول میں مزاحمت کو محض ردعمل نہیں بلکہ شعوری انتخاب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔مصنفہ یہ تاثر دیتی ہیں کہ فلسطینی کردار اپنی حالت کے اسیر نہیں بلکہ اپنے فیصلوں کے ذمہ دار ہیں۔وہ حالات سے مجبور ہوتے ہوئے بھی بے اختیار نہیں اور یہی اختیار احساس مزاحمت کی بنیاد بنتا ہے۔جب کوئی کردار خوف کے باوجود سچ بولنے یا اپنے حق پر قائم رہنے کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ دراصل اپنی داخلی آزادی کا اعلان کرتا ہے۔ مزاحمت کا ایک اہم پہلو مکالموں کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ کرداروں کی گفتگو میں بار بار یہ احساس جھلکتا ہے کہ زمین کا مسئلہ صرف جائیداد کا نہیں بلکہ شناخت کا ہے۔یہ شعور کہ زمین چھوڑ دینا اپنی تاریخ چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔ کرداروں کو نفسیاتی طور پر مضبوط بناتا ہے۔اس طرح مصنفہ مزاحمت کو ایک فکری دلیل کے ساتھ جوڑ دیتی ہیں جس سے جدوجہد محض جذباتی نہیں رہتی بلکہ منطقی اور اصولی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ناول میں بعض مقامات پر خوشی بھی مزاحمت بن جاتی ہے۔ قید، تفتیش یا دباؤ کے لمحوں میں کردار جب غیر ضروری صفائی دینے کی بجائے خاموش وقار اختیار کرتے ہیں تو یہ رویہ طاقت کے سامنے جھکنے سے انکار کی علامت بن جاتا ہے۔ اس خاموشی میں احتجاج بھی ہے اور اعتماد بھی۔ مصنفہ اس باریک نکتے کو بڑی مہارت سے پیش کرتی ہیں کہ بعض مقامات پر الفاظ سے زیادہ اثر خاموشی پیدا کرتی ہے۔ناول میں امید کی منتقلی بھی ہے۔ بزرگ کردار نئی نسل کو صرف ماضی کے واقعات نہیں سناتے بلکہ مستقبل کا خواب بھی رہتے ہیں۔وہ شکست کو حتمی حقیقت کے طور پر قبول نہیں کرتے۔ اس طرح ناول میں مزاحمت وقت کے تسلسل میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ماضی کی یاد، حال کی آزمائش اور مستقبل کی توقع تینوں ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ یہ زمانی تسلسل جدوجہد کو عارضی کیفیت بننے سے بچاتا ہے۔ معاشی مشکلات اور روزمرہ کی تنگیوں کو بھی مصنفہ نے جدوجہد کے تناظر میں دکھایا ہے۔ جب کردار محدود وسائل کے باوجود اپنے گھروں اور بچوں کی تعلیم کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ عمل بھی مزاحمت کا

حصہ بن جاتا ہے۔ گویا زندگی کو معمول پر رکھنے کی کوشش خود ایک اعلان ہے کہ جبر انھیں مکمل طور پر مفلوج نہیں کر سکا۔ اس پہلو سے ناول میں مزاحمت زندگی کے تسلسل کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔

> "کیمپوں میں پیدا ہونے والی نسل جن کے عارضی بنے سکولوں پر بھی بمباری کے شعلے بھڑکتے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ بچے پڑھیں۔ تو یہ بچے دھرتی پر بہنے والے اس پانی کی طرح سے ہیں جسے کسی قاعدے میں نہ ڈالا جائے تو وہ اپنے راستے خود بناتا ہے اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ ایسے ہی ان بچوں نے جن کے پاس بندوقیں نہیں، گولیاں نہیں، چھت نہیں، ممتا نہیں، پدرانہ شفقت نہیں۔ ہاتھوں میں پتھر اور ڈنڈے اٹھا کر ایک نئے انتقاضہ کا اعلان کر دیا ہے۔ جبر کے ہاتھوں پس جانے والے لوگوں کے اندر سے بے اختیار پھوٹ نکلنے والا لاوہ جس نے صیہونیت کو لرزا دیا ہے۔"(9)

ناول کا بیانیہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ مزاحمت یکساں مزاج کا عمل نہیں۔ کچھ کردار جذباتی شدت رکھتے ہیں۔ کچھ سنجیدہ تدبر کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور کچھ خاموش خدمت کے ذریعے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ تنوع جدوجہد کو انسانی بناتا ہے۔ مصنفہ کسی ایک طرزِ عمل کو مطلق قرار نہیں دیتیں۔ بلکہ مختلف رویوں کو ایک ہی مقصد کی مختلف جہات کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ناول میں علامتی مناظر مزاحمت کے تصور کو گہرائی دیتے ہیں۔ تباہ شدہ مکانات کے درمیان کھڑا ہوا کوئی درخت یا ملبے کے باوجود لہراتا ہوا پرچم، محض منظر نہیں بلکہ عزم کی تصویری شکل ہیں۔ ان علامتوں کے ذریعے مصنفہ قاری کو یہ احساس دلاتی ہیں کہ مادی نقصان کے باوجود روحانی اور اخلاقی طاقت باقی رہتی ہے۔ یہی باقی رہنے والی قوت مزاحمت کی اصل بنیاد ہے۔ ناول میں مذہبی اور اخلاقی کردار بھی جدوجہد کے استحکام میں کردار ادا کرتی ہیں مگر انھیں خطیبانہ انداز میں پیش نہیں کیا گیا۔ کرداروں کے اعمال اور فیصلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موقف کو انصاف اور حق کے اصولوں سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ یہ اخلاقی وابستگی انھیں وقتی فائدے کے لیے سمجھوتہ کرنے سے روکتی ہے۔ اس طرح مزاحمت ایک اعلیٰ اخلاقی معیار سے جڑ جاتی ہے۔

مصنفہ نے یہ بھی دکھایا ہے کہ جدوجہد کا راستہ آسان نہیں۔ اس میں داخلی اختلافات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعض کردار حکمت عملی کے اختلاف میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں مگر مجموعی مقصد پر اتفاق برقرار رہتا ہے۔ یہ پہلو ناول کو حقیقت کے قریب لے آتا ہے کیونکہ ہر تحریک میں فکری تنوع موجود ہوتا ہے۔ اس تنوع کے باوجود اتحاد قائم رکھنا خود ایک بڑی مزاحمت ہے۔ مزاحمت کے بیانیے میں جذباتی شدت کے ساتھ ساتھ فکری سنجیدی بھی موجود ہے۔ مصنفہ واقعات کو اس طرح ترتیب دیتی ہیں کہ قاری محض ہمدردی محسوس نہ کرے بلکہ مسئلے کی گہرائی کو سمجھے۔ اس فکری ترتیب کے باعث ناول احتجاجی ادب کی سطح بلند ہو کر سنجیدہ ادبی مکالمے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی اس کی فنی کامیابی ہے۔

لہو رنگ فلسطین میں مزاحمت کو زندگی کے ہر شعبے سے جوڑ دیا گیا ہے۔ خاندان، تعلیم، مذہب، تاریخ، معاشرے اور نفسیات سب اس کے دائرے میں شامل ہیں۔ سلمیٰ اعوان نے اس تصور کو کسی ایک زاویے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک ہمہ گیر انسانی تجربے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس ہمہ گیریت کے باعث ناول فلسطین کی جدوجہد کو عالمی انسانی ضمیر سے مربوط کر دیتا ہے۔ ناول میں مزاحمت جذباتی ردعمل یا وقتی حکمت عملی کی صورت میں موجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل فکری اور اخلاقی رویہ ہے جو فرد سے لے کر اجتماع تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی رویہ اس ناول کی فکری بنیاد کو استحکام عطا کرتا ہے اور اسے مزاحمتی ادب کی اہم مثالوں میں شامل کرتا ہے۔

مصنفہ دکھاتی ہے کہ جبر ہمیشہ تلوار یا ہتھکڑی کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یہ معاشرتی ڈھانچوں، روایات، خوف اور غیری یقینی مستقبل کی شکل میں انسان کو گھیر لیتا ہے ایسے جبر کے خلاف بغاوت بھی ظاہری نہیں بلکہ باطنی ہوتی ہے۔ فلسطین بھی ایک ایسی سرزمین ہے جہاں لوگ بظاہر عام زندگی گزارتے ہیں مگر ان کی روزمرہ زندگی کے ہر لمحے میں جبر کی پرچھائیاں موجود ہوتی ہیں ۔ مزاحمت کا ایک اہم پہلو شعور کی بیداری ہے۔ ناول کے کردار اپنے حالات پر غور کرتے ہیں ، سوال اٹھاتے ہیں اور اپنی محرومی کو محسوس کرتے ہیں ۔ یہ احساس ہی مزاحمت کا پہلا قدم ہے۔

> "ان کی مائیں اپنے بچوں کو جو کہانیاں سناتی ہیں ان میں "ایک تھا بادشاہ اور ایک تھی ملکہ" نہیں ہوتا۔ ان میں ہوتا ہے "ایک آزاد ملک تھا" اس میں ایک طاقتور ملک نے ایک بزدل قوم کو لا بسایا اور طاقتور ملک کے برتے پر وہ بزدل لوگ خود کو دلیر سمجھنے لگے۔"(10)

ناول لہو رنگ فلسطین ایک زندہ دستاویز ہے جو فلسطین کی سرزمین پر جاری ظلم، جدوجہد اور امید کی داستان کو نہایت موثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ ناول انسانی احساسات، قربانیاں اور آزادی کی تڑپ کا ایسا مرقع ہے جس میں قاری خود کو کرداروں کے ساتھ جڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول کے ذریعے فلسطینی عوام کے دکھ، ان کی مزاحمت اور ان کے ناقابل شکست حوصلے کو علامتی اور حقیقی دونوں سطحوں پر اجاگر کیا ہے۔ ناول میں مزاحمت اور امید کا عنصر دکھائی دیتا ہے شدید گھٹن کے باوجود ناول کے کردار اپنے اندر امید کی کرن کو زندہ رکھتے ہیں اور یہی امید بذات خود مزاحمت کی ایک صورت بن جاتی ہے اور یہ مزاحمت اور امید دھیمی آنچ کی طرح مسلسل جلتی رہتی ہے۔

> "لہو ہمیشہ سے سرخرو ہے
> لوگوں کی تحریر ہی ازل سے ابد نشاں ہے
> کہ عہد ظلمات و جبر و جور و جفا میں اکثر
> لہو نے روشن، دلیر، زندہ روایتوں کو دوام بخشا

یہ میرے ماضی کا ایک سچ ہے
جو دور حاضر کو اس نے ورثے میں دے دیا ہے
یہ سچ فلسطینیوں کے خوں صداقتوں کی امانتوں کو
مزاحمت کے وہی قرینے سکھا رہے ہیں
جو ایک دن پھر بشارتوں کے لباس پہنے
امر صحیفوں کے لفظ بن کر چمک اٹھیں گے!
ابھی تو جاری ہے جنگ لیکن مجھے ایک آواز
حوصلوں کی رفاقتوں جیسی لگ رہی ہے
کہ جیسے نوک سناں سے کوئی
تلاوتوں کا سرور بانٹے
لہو کا روشن شعور بانٹے" (11)

فلسطین کا مقدمہ کافی مدت سے چلا آرہا ہے۔ اس کی تازہ صورت حال کافی تشویش ناک ہے۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد مشہور مستشرق ایڈورڈ سعید، جو خود بیت المقدس میں پیدا ہوئے، نے 'مسئلہ فلسطین' کے عنوان سے کتاب لکھی۔ جس میں انہوں نے مفصل حالات قلمبند کیے۔ اردو میں اس کا ترجمہ شاہد حمید نے کیا جس میں انہوں نے حواشی میں مزید حالات و واقعات کا اضافہ کیا۔ اس وقت کی مغربی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"تاہم میرا گمان ہے کہ جب بھی میرے (امریکی اور یورپی) قارئین کے سامنے فلسطینی مسئلہ آتا ہے، تو ان میں سے بہتوں کے ذہنوں میں فوراً دہشت گردی کا تصور لپکنے لگتا ہے۔ اور میں نے اس کتاب میں دہشت گردی کا جو زیادہ ذکر نہیں کیا تو اس کی جزوی وجہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کو بالکل ناجائز اور غیر منصفانہ انداز سے جس سے کینہ اور بغض چھلکتا ہے، دہشت گردی کے مترادف قرار دے دیا جاتا ہے۔"(12)

لہو رنگ فلسطین ا ایک ایسا ناول ہے جو نہ صرف فلسطین کی حقیقت کو بیان کرتا ہے بلکہ انسانیت کے ضمیر کو بھی جھنجھوڑتا ہے یہ درد کی داستان بھی ہے مزاحمت کی علامت بھی اور امید کی کرن بھی۔ سلمیٰ اعوان نے اس تخلیق کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ ادب صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک طاقتور ہتھیار بھی ہے جو ظلم کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہے اور مظلوموں کی نمائندگی کر سکتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

1 سلمیٰ اعوان، لہو رنگ فلسطین، بک کارنر، جہلم، 2024ء، ص 251

2۔ ایضاً، ص 210

3۔ ایضاً، ص 98

4۔ ایضاً، ص 213

5۔ ایضاً، ص 50

6۔ ایضاً، ص 209

7۔ ایضاً، ص 246

8۔ ایضاً، ص 237

9۔ ایضاً، ص 253۔254

10۔ حسن منظر، "حبس" بک کارنر، جہلم، 2023ء، ص 198–187

11۔ پروفیسر فتح محمد ملک، "فلسطین اردو ادب میں" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2000ء، ص 223

12۔ شاہد حمید (مترجم)، مسئلہ فلسطین از ایڈورڈ سعید، ایلفا برادو، لاہور، 1991ء، ص 5

References in Roman Script:

1. Salma Awan, Lahoo Rang Falasteen, Book Corner, Jhelum, 2024, p. 251.
2. Ibid., p. 210
3. Ibid., p. 98
4. Ibid., p. 213
5. Ibid., p. 50
6. Ibid., p. 209
7. Ibid., p. 246
8. Ibid., p. 237
9. Ibid., pp. 253–254
10. Hasan Manzar, Habs, Book Corner, Jhelum, 2023, pp. 198, 187.
11. Professor Fatah Muhammad Malik, Falasteen Urdu Adab Mein, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2000, p. 223–140
12. Shahid Hameed (translator), *Mas'ala-e-Filastīn* by Edward Saīd, Alpha Bravo, Lahore, 1991, p. 5.